… سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(اقبال)

اقبال

اور

وطن کی محبت

مولوی محمد سلیمان صاحب بی - ایل کشن گنج

باہتمام محبوب الرحمٰن مطبوعہ محبوب عالم پریس کشنگنج پورنیہ

قیمت ۳/

تمہید

بزم ادب کشن گنج میں اقبال مرحوم کی وفات پر ۵ر مئی ۱۹۳۸ء کو تعزیتی جلسہ تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اقبال پر ایک مضمون پڑھوں۔ وطن کی محبت کا موضوع مجھے مناسب معلوم ہوا چنانچہ اس مضمون کی ترتیب عمل میں آئی اور پڑھا گیا

مقامی اخبار آئینہ نے اسے مختلف اشاعتوں میں شائع کیا تھا۔ اب کتابی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی جسقدر بھی تبلیغ و اشاعت کی جائے اور جن جن صورتوں میں بھی کی جائے ضروری۔ بجا اور بدرجہا مفید ہے۔ اسی امر کو مدنظر رکھکر اس طرف توجہ کی گئی۔

کاشانہ
۷ر اگست ۱۹۳۸ء

محمد سلیمان

مختصر سوانح حیات ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ

پیدائش بمقام سیال کوٹ در ۱۸۷۶ء۔ بغرض حصول تعلیم پہلے مکتب و مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اسکاچ مشن کالج سیال کوٹ سے ایف۔ اے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ دوران حصول تعلیم میں از ابتدا تا انتہا غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیتے رہے اور برابر تمغہ جات اور وظائف پاتے رہے۔ فارغ التعلیم ہو کر اورنٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں کچھ دنوں تک پروفیسری کی۔ ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو بیرسٹر اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہو کر لوٹے۔

۱۹۱۴ء میں اسرار خودی شائع ہوئی ۱۹۱۶ء میں رموز بیخودی اور ۱۹۲۴ء میں بانگ درا۔ بعد کو پیام مشرق۔ جاوید نامہ اور زبور عجم فارسی میں اور بال جبریل (۱۹۳۵ء) اور ضرب کلیم اردو میں شائع ہوئیں۔

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو سارے ہندوستان میں یوم اقبال منایا گیا اور ۹ صفر ۱۳۵۷ ہجری ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو آپ اکسٹھ ۶۱ برس کی عمر میں اس دنیا سے اٹھ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی ہیں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

دنیا ابھی اقبال سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ درحقیقت اقبؔال کو صحیح معنوں میں جاننا آسان بھی نہیں۔ عوام تو کیا خاص اصحاب بھی اقبال کو محض اپنی اہلیت تک جانتے ہیں۔ ورنہ اقبؔال کو جاننا بڑی حد تک باقی رہجاتا ہے۔ خود اقبال کہتے ہیں۔

اقبؔال بھی اقبؔال سے آگاہ نہیں ہے ۔۔۔ کچھ اسمیں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

بھلا کوئی ایسے شخص کو جانے بھی تو کیا جانے۔ ایک زاہد کی زبانی اپنی حالت یوں بتاتے ہیں۔

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا ۔۔۔ ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ خوانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل ۔۔۔ مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانند سحر اسکی جوانی

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفتر حکمت ہی طبیعت خفقانی

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونق ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

عین شغل مے میں پیشانی تری ہے سجدہ ریز
کچھ ترے مشرب میں رنگ مسلک مینا بھی ہے

ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعت پرواز سے
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے

غرض بظاہر یہ حیران کن مجموعۂ اضداد ہیں آج کوئی تو انھیں فلسفی کہتا ہے۔ کوئی سیاست داں۔ کوئی شاعر اسلام اور کوئی شاعر وطن۔ خود کہتے ہیں ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

میں کہتا ہوں ممکن ہے اقبال ابھی تک مجموعۂ اضداد بنے رہیں لیکن ایک وقت آئیگا کہ آنکھیں کھلیں گی اور یہ معمہ حل ہو جائیگا۔ روشنی پھیلیگی

اور تاریکی غائب ہوگی۔ یہ آپ نے سنا ہوگا کہ چند اندھوں کو ایک ہاتھی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور ان کے ہاتھ اسکے مختلف اعضا پر پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہاتھی کو مجموعۂ اضداد بنا ڈالا۔ پس آج ایک حد تک ہم میں اقبال کی یہی حالت ہو رہی ہے۔

سمجھنے میں بھی انھیں میں سے ایک ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی اہلیت کی بنا پر اقبال کو جو کچھ سمجھ رکھا ہے آج اسکا محض ایک مختصر پہلو آپ کے سامنے رکھوں۔

اقبال نے اپنی تحریروں میں عشق و محبت کو بہت بڑا درجہ دیا ہے اور دنیا کو جو پیغام انھوں نے بڑے زوروں کے ساتھ دیا ہے وہ اسی کا سبق ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ز شعر دلکش اقبال می تواں دریافت کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

اقبال نے انسانیت کامل کی تبلیغ کی ہے اور اس انسانیت کامل کو اپنے نقطۂ نگاہ سے اسلام کا نام دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اقبال نے اسلام کو کسی محدود معنی میں استعمال کر کے اسکی پیغمبری کی ہے انھوں نے انسانیت کو اسلام کا نام دیا ہے۔ اب اگر ہندویت یا مسیحیت

یا کوئی اور مذہب انسانیت کو مطمح نظر قرار دے تو وہ بھی اسلامیت ہے لہذا انکے اسلام میں یہ سارے مذاہب آجاتے ہیں کوئی اختلاف ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر اقبال کی تصانیف پڑھی جائیں تو اکثر غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

بعض صاحبان کو شکایت ہے کہ اقبال وطن دوستی کے مخالف تھے یہ سراسر غلط ہے۔ بات یوں ہے کہ اقبال انسانیت کو وطنیت پر ہر آئینہ قربان کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ہر آئینہ اسکو برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ناروا وطنیت کے زیر اثر انسان نوع انسان کا غنکار بن جائے۔ وہ کہتے ہیں

اقوام جہاں میں رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

اقبال حب وطن کے مخالف نہ تھے۔ بلکہ اس عصبیت کے خلاف تھے جس سے انسانیت چھن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ انکے کلام سے آپکے سامنے یہ ثابت کروں کہ اقبال اپنے وطن کی محبت میں کسقدر سرشار تھے۔ ہندوستان کا جو درد آج گاندھی جی کے دل میں ہے اقبال ابتداء

سے اس درد سے بے چین رہے ۔

میں آپ کو انکے وہ پہلے شعر سناتا ہوں جو انھوں نے اپنی طالب العلمی کے زمانے میں محض ایک مبتدی کی حیثیت سے پڑھے تھے۔ وہ شعر یہ ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ قوم ہی کے نام پر انکی زبان کھلتی ہے۔

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر   چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں   مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

انکی پہلی مطبوعہ نظم جو مخزن میں شائع ہوئی وہ ہمالہ والی نظم ہے. کیا کوئی بھی انکی اس نظم کو پڑھکر یا سنکر اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اقبال کا دل وطن کی محبت سے لبریز تھا۔ کہتے ہیں ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں   چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اور سنئے ؎

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کیلئے   تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کیلئے

کیا غلبۂ حب وطن کے سوا اسمیں کوئی اور شئے کارفرما ہے۔ اور کیا کہتے ہیں؟ سنئے ؎

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو   پاسباں اپنا ہے تو۔ دیوارِ ہندوستاں ہے تو

مطلعِ اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دیدیا برقِ سرِ کہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

یہ لمبی نظم ہے۔ اسکے متعلق سر عبدالقادر کہتے ہیں " شیخ محمد اقبال نے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جسمیں کوہ ہمالہ سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی۔ اسمیں انگریزی خیالات اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اسمیں موجود تھی"۔

اقبال کی ایک نظم ہے "بچے کی دعا" اسکا ایک شعر سنئے۔ دیکھئے کہ وہ بچوں کو کیا درس دیتے ہیں اور بچپن سے انکے قلب میں کیسے خیالات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جسطرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اب آپ ذرا جگر تھام کے بیٹھیں میں آپکو انکی درد بھری نظم "تصویرِ درد" کے بعض حصے سنانا چاہتا ہوں۔ اور دکھانا چاہتا ہوں کہ اقبال کسقدر دردِ

وطن سے بے چین تھا۔ ملاحظہ ہو ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہی زباں میری

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

مرا رونا نہیں۔ رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

آہ!

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دیدیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھکو تیری نوحہ خوانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونیوالا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہجوم جذبات سے مغلوب ہوتے ہیں۔ جوش میں آکر کہتے ہیں۔

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کرکے چھوڑونگا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑونگا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں کو چراغاں کرکے چھوڑونگا

مگر غنچوں کی صورت ہو دلِ دردآشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑونگا

آہ دیکھئے کتنا پاکیزہ عزم ہے ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھری دانوں کو جو مشکل ہی تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا

اُف !

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نغمہ خوانی میں عبادت چشم شاعر کی ہی ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھکر شاخِ گل پر آشیاں اپنا چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہی تیری اگر منظور ہی دنیا میں اے بیگانہ خو رہنا

آگے چلکر کہتے ہیں ؎

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئین نے قوموں کو مرے اہل وطن کی دلیں کچھ فکر وطن بھی ہے

وہ کہتے ہیں ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

اب میں آپکی توجہ ان میٹھے میٹھے منتروں کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے وطن کے مندر میں گائے ہیں۔ کون ہے جو انکا ہندی ترانہ پڑھکر یا سنکر وطنی احساسات سے مغلوب نہ ہو ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

یہ نظم انگلینڈ میں لکھی گئی تھی۔ شبہ ہوا۔ لوگ یہ سمجھ لیں کہ انگلستان کی

تماشا گاہ میں ہندوستان کو بھول گیا ہے اسکی تردید کرتے ہیں سہ

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

انگلستان میں رہکر بھی اپنے ہمالہ کو نہیں بھولتے۔ کہتے ہیں سہ

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

ہمارا شاعر وطنی عصبیت سے پاک نہیں رہ سکتا ہے۔ کہتا ہے سہ

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہندوستان میں مختلف مذاہب کو پاکر ہوشیار کرتے ہیں سہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کون ہے جو اس سادہ سے الفاظ اور جذبات سے پُر مصرعہ کو نہ دہرائے۔

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

بعض تنگ خیال انھیں جو کچھ بھی کہیں۔ لیکن انکا دل دردِ وطن سے

جسقدر بھرا تھا اسکو وہی جانتے تھے۔ کہتے ہیں سہ

اقبال اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں معلوم کیا کسیکو دردِ نہاں ہمارا

یہ تو تھا ترانہ اس قومی گیت کو بھی لیجیے جو انھوں نے ہندوستانی بچوں

کیلئے لکھا ہے۔ اور اسے ہندوستانی بچوں کے قومی گیت کا نام دیا ہے

لکھتے ہیں ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جسکو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جسکی حق نے زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسمان سے — پھر تاب دیکے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے — میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

بندے کلیمؑ جسکے پربت جہاں کے سینا — نوحؑ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا — جنت کی زندگی ہے جسکی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

اب آئیے اقبال کے "نئے شوالہ" کی زیارت کریں۔ کیسے پاکیزہ جذبات

ہیں۔ اور کیا ہی انداز بیان ہے۔ کون ایسا ہندی ہوگا جو اسے پڑھکر جھوم نہ جائیگا ؎

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آغیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اسکا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اتنک میں نے ان نظموں کے حوالہ دیئے ہیں جنمیں براہ راست ہندوستان سے خطاب ہے یا ہندو ان کا تذکرہ ہے۔ لیکن اقبال نے اپنی تصانیف میں بعض ایسے امور کا بھی ذکر کیا ہے جنکو ہندوستان سے تعلق ہے اور ان سے اقبال کے حب وطن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انکی ایک

نظم ہے "آفتاب" پہلا شعر ہے ؎

اے آفتاب! روح روان جہاں ہے تو　　شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو

یہ پوری نظم گایتری کا ترجمہ ہے۔ سنتا ہوں کہ برادران وطن میں گایتری کو بڑی اہمیت ہے۔ کیا اسکے ترجمہ میں اقبال کو برادران وطن کی محبت نے نہیں ابھارا۔ انکی ایک نظم ہے "سوامی رام تیرتھ" کہتے ہیں ؎

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو　　پہلے گوہر تھا۔ بنا اب گوہر نایاب تو

آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو　　میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو

آخری شعر ہے ؎

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق　　ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

ایک دوسری نظم ہے جسکی سرخی ہے "رام" محب وطن شاعر اپنے جذبات کا کیونکر مظاہرہ کرتا ہے اندازہ لگائیں ؎

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جام ہند　　سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند

یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر　　رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت　　مشہور جنکے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز　　اہل نظر سمجھتے ہیں اسکو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا — پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

اقبال نے گرو نانک کے حضور میں بھی اپنی نذر عقیدت پیش کی ہے انکی ایک نظم ہے جو خاص نانک پر ہے۔ شاعر نے کس انداز میں ان پر قلم فرسائی کی ہے۔ دیکھا جائے

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

نظم ہے نانک پر لیکن ان کے دل میں گوتم بدھ کی جو عظمت ہے وہ بھی نمایاں ہو رہی ہے۔ ذرا گوہر یک دانہ کے الفاظ پر غور کریں ہندوستان میں جو گوتم کی ناقدری ہوئی یا ہو رہی ہے۔ اسکا بھی رونا روتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

آہ! بد قسمت رہے آواز حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکارا اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا — ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی — بارش رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کیلئے ہندوستاں غم خانہ ہے — درد انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں — شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا | نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے | ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

کیا ان نظموں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اقبال کا دل ان بزرگوں کی محبت سے معمور تھا؟ کیا انکی محبت ہندوستان کی محبت نہیں؟ بیشک اقبال کو ہندوستان سے محبت تھی۔ انکا دل ہندوستان کے درد میں بیچین تھا۔ کیا شودر کے درد کی ترجمانی اقبال نے جس انداز میں کی ہے اور جب کی ہے مستحق داد نہیں۔ کیا کسی اور رہنما کی توجہ اُسوقت تک ان آجکل کے ہریجنوں کی طرف پھری تھی؟ کیا اقبال نے سب سے پہلے یہ آواز نہیں اٹھائی؟ وہ ہندوستانی تحریکات سے بھی بے نیاز نہ رہ سکے۔ سیاسی اسیری اور نظربندیوں سے اثر پذیر ہوکر جو نظم انھوں نے لکھی ہے اسیری کے فلسفہ کو واضح کرتی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند | قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے | مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر | کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست | ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

سیاسی اصلاحات جو ہندوستانیوں کو ملے ہیں ان سے وہ ہر آئینہ مطمئن نہیں تھے۔ صاف کہتے ہیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن۔ ممبری۔ کونسل۔ صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے

سلطنت پر انھوں نے جو نظم لکھی ہے وہ سلاطین کے رازِ درونِ پردہ کا افشا کرتی ہے۔ اسمیں ہندوستان کے حالات کو مدنظر رکھا گیا ہے کہتے ہیں

آ بتا دوں تجھکو رمزِ آیۂ ان الملوک — سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتا ہے اسکو حکمراں کی ساحری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ دارونکی ہے جنگ زرگری

ہندوستانیوں کی بیجا تقلید مغرب سے شاعر کو نفرت ہے۔ اس پر لکھتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شاعر کو بے پردگی پسند نہیں ہے۔ چٹکی لیتے ہیں ؎

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے

وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

مغربیت میں بہ جانا پسند نہیں آتا۔ جھنجھلا کر کہتے ہیں ؎

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفع مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بِل پیش کیجئے

ہندوستانیوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ یہ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کیلئے بھی دوسروں کے دست نگر ہیں۔ بگڑتے ہیں۔ اور بگڑ کر کہتے ہیں ؎

انتہا بھی اسکی آخر ہے خریدیں کب تک
چھتریاں۔ رومال۔ مفلر پیرہن جاپان سے

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئینگے غسال کابل سے کفن جاپان سے

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لیکے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

اور کہتے ہیں ؎

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری۔ یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

بھلا کوئی بتا سکتا ہے کہ اگر یہ وطن کی محبت نہیں تو کیا ہے کہ لندن میں بیٹھے ہوئے اپنے لخت جگر کو لکھ بھیجتے ہیں ؎

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

اب میں آپکو اقبال کی ایک اور نظم صدائے درد سنا کر بس کرتا ہوں۔ اور آپکا فیصلہ سننا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارا یہ شاعر ہندوستانیوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت قابل پرستش نہیں۔ اگر کسی شاعر کی پرستش جائز ہو۔ کیا کوئی بھی ہندوستانی ایسا ہے جو اس محب وطن شاعر کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے سے باز رہ سکتا ہے۔ آہ! آج اقبال ہم میں نہیں ہیں لیکن انکی صدائے درد ہمیں مرغ بسمل بنا رہی ہے۔ کسقدر پر درد صدا ہے ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

غور کریں :- ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جسکے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

سنہ ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال مدراس گئے ہوئے تھے وہاں پر روزانہ اخبار سوراجیہ کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ہندوستان کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور اپنا نظریہ پیش کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان کو دنیا میں کس درجہ پر دیکھنا چاہتے تھے آپ کہتے ہیں میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہ ہوگا جو مذہب سے بے نیاز ہو۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کسطرح یکجا جمع کیا جائے ..... ترک روحانیت اور مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکامیاب رہے ....

میرا عقیدہ ہے کہ باشندگان ہند اس کار عظیم کو انجام دینے کے اہل ثابت ہونگے۔ کیونکہ انکی مذہبی روایات انکے ادراک کی تیزی اور انکے جذبات کی شدت اس کام کی اہلیت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوع انسان کی عام بھلائی کیلئے میں یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مفاہمت کا متمنی رہتا ہوں۔ اور اسے اشد ضروری خیال کرتا ہوں۔ صرف باشندگان ہند ہی پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کیلئے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں" دیکھا آپ نے ہندوستان کو کیسی اعلیٰ جگہ میں دیکھنا چاہتے تھے

حاضرین! ہمارا یہ پیغمبر آج ہم سے دور ہوگیا۔ ہمارا اقبال ہم سے چھن گیا انھوں نے خود کہا ہے ؎

زندگی انسان کی دم کے سوا کچھ بھی نہیں　　دم ہوا کی موج ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں

اپنی مادر مرحومہ کی یاد میں انھوں نے کتنا سچ کہا ہے ؎

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت　　گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں　　کیسی کیسی دختران مادر ایام ... ہیں

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت　　دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں　　ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں — اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن وہ پھر خود ہی فرماتے ہیں ؎

ختم ہو جائیگا لیکن امتحاں کا دور بھی — ہیں پسِ نُہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

جھاڑیاں جنکے قفس میں قید ہے آہِ خزاں — سبز کر دیگی انھیں بادِ بہارِ گلستاں

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں — ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جسطرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں — موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

ڈاکٹر اقبال سر میاں فضل حسین کو انکے والد کی وفات پر لکھتے ہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں — نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

اور آگے کہتے ہیں ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو — یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر — راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر — فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو — جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جسطرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

حاضرین! ہمارے لئے کوئی چارۂ کار نہیں کہ اپنی اس مصیبت کی گھڑی میں اپنے درد والم کے اس عالم میں مرحوم کے اپنے پیامات سے استفادہ کریں۔ ہمیں اسکا پورالیقین ہے کہ ہمارا شاعر زندۂ جاوید ہے اور بقول خود

رخت باز از نیستی بیروں کشد   چوں گل از خاک مزار خود دمد

اب میں اپنا جذبۂ دل شاعر کے ایک شعر میں ادا کرتے ہوئے اپنے اس ناقص اور سطحی مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اور سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں ؎

اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک من بر خاک پاک او رساں

(محمد سلیمان بی۔ اے)

نذرِ عقیدت

بہ تقریب یوم اقبال ۹ جنوری ۱۹۳۸ء

اقبال کا ترانہ ہے حرزِ جاں ہمارا
دل کی صدا ہماری رازِ نہاں ہمارا

وہ دیدۂ جماعت وہ آبروئے ملت
ہمدرد وہ ہمارا۔ وہ ترجماں ہمارا

جاگ اٹھی ساری بستی آواز دی کچھ ایسی
جاتا رہا اسی سے خوابِ گراں ہمارا

نابود ہو رہے ہیں مایوسیوں کے بادل
امید کی کرن سے چمکا جہاں ہمارا

پیمانِ سجدہ پھر سے تازہ کیا انھوں نے
ہے آستاں حرم کا سجدہ نشاں ہمارا

نامِ رسول کا دل پھر آج ہے فدائی
یہ نام پھر ہوا ہے آرام جاں ہمارا

"یا رب" کی لذتوں سے معمور پھر ہوا دل
درمان بن رہا ہے دردِ نہاں ہمارا

ہے ہم سخن خدا سے اور ہے لبالب احسن
مقبولِ درگہِ حق ہے شکوہ خواں ہمارا

شوخی برق جلوہ جسکے کلام میں ہے
پایا کلام ایسا موسیٰ بیاں ہمارا

ہاں ہاں "گل بخشیں" "گلشن" کا ہے ہمارے
پیغامِ گل کا حامل وہ نغمہ خواں ہمارا

میکش ہے پھر وہی آج میخانہ بھی وہی ہے
آتش بجام پھر ہے پیرِ مغاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگ درا تھا گویا
سنتے ہی چل پڑا ہے پھر کارواں ہمارا

یادِ اقبال

۲۷ر اپریل ۱۹۳۸ء

اقبال کا ترانہ ہے ترجماں ہمارا
معلوم تھا اسیکو درد نہاں ہمارا

ہر بار تازہ تر ہے ہر بار نو بہ نو ہے
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

حُبِ وطن کے منتر گائے ہیں میٹھے میٹھے
پیغمبرِ محبت تھا نغمہ خواں ہمارا

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا تھا اسکا تیرتھ
دیر و حرم سے بالا اک آستاں ہمارا

ہر ذرہ دیوتا تھا خاکِ وطن کا اسکو
تھا دیس کا بھگت اک جادو بیاں ہمارا

افسردہ ہو رہی تھی اپنے وطن کی محفل
آتش بجام آیا پیرِ مغاں ہمارا

غربت میں بھی وہ جب تھا دل اسکا وطن میں تھا
ہم سے الگ ہوا ہے شاعر کہاں ہمارا

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"
یہ درس دے گیا ہے وہ رازداں ہمارا

دھرتی کے باسیوں کو میت کی پلا کر
بچھڑوں کو بھر ملایا پیرِ مغاں ہمارا

چپ ہو گیا یکایک کیوں بلبلِ نوا زن
سونا پڑا ہوا ہے اُن گلستاں ہمارا

اے آبِ رود گنگا قطراتِ اشک بنجا
خاموش ہو رہا ہے افسانہ خواں ہمارا

اے سر بلند پربت تو پاش پاش ہو جا
خلوت نشیں ہوا ہے تاریخ داں ہمارا

اقبال اٹھ گیا ہے اے ہمنشیں غلط ہے
حاضر ہے آج ہم میں وہ نغمہ خواں ہمارا

اسکی نوائے عالم معمور ہو رہا ہے — اور گونجتا رہیگا "ہندوستاں ہمارا"

حاصل اسے ہوئی ہے بیشک حیات جاوید — اور موت سے نڈر ہے جانِ جہاں ہمارا

بانگ درا ہے ہمیں غافل کو تازیانہ — ہشیار ہو چکا ہے اب کارواں ہمارا

اقبال کا ترانہ گائیں نہ کیوں سیماں

"ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

نوٹ:۔ یہ کتاب محبوب عالم پریس۔ کشن گنج میں بھی ملتی ہے۔

وطن کے گیت

دیس

۲۱ اگست ۱۹۳۶ء

کیا قدر بھلا دُرِّ عدن کی ہے عدن میں　　کیا مشک کی قیمت ہی بھلا شہرِ ختن میں
گل ہار گلے کا نہیں بنتا ہے چمن میں

یوسف بکیں بے دام جو کنعاں میں رہیں وہ　　کنعاں سے نکلیں تو کبھی راج کریں وہ
ہے لعل بھی ارزاں جو ہو بازارِ یمن میں

ہے کون خریدار جو دریا میں پڑا ہو　　جب نکلے گہر کان سے تب تاج میں جا ہو
میکے میں کہاں کوئی پہن دیکھی دلھن میں

اپنا جو نہیں دام کوئی دیس میں مانا　　دیسی کی نہیں قدر، ہی سچ آپ کا کہنا
پھر بھی تو جگہ دیس کی ہر لحظہ ہی من میں

غربت میں بڑھے قدر جو اپنی تو مجھے کیا　　ہاں! دیس کی عزت جو بڑھے تب ہے گوارا
ہے گل کی مہک میرے لئے خارِ وطن میں

یورپ کا کرے ذکر نہ کوئی مرے آگے　　جنت کا نمونہ ہے مرے دیس کو دیکھے

کوثر کا یہ پانی ہے رواں گنگ و جمن میں
ہے تیری گلی ملک سلیماں سے بھی بہتر اے ہند گدائی میں تری ہم رہیں خوشتر
غربت میں بھی دل اپنا سدا ہوگا وطن میں
ہیں ہند کے دن پھرنے کو آثار ہیں ایسے جب تک نہ پھریں کہدو کہ ہم دم نہیں لیتے
ہے صاف اثر اس کا مرے رنگ سخن میں

اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانا

۱۷ دسمبر ۱۹۳۷ء

آخر چمک اٹھیگا بھارت کا کارخانہ ہوگا موافقت میں اپنی کبھی زمانہ
ہوگی زمیں بھی اپنی اپنا فلک بھی ہوگا اغیار کا نہ ہوگا پھر رعب قیصرانہ
ہونگے یہاں سکھی سب ہوگا جو راج اپنا مٹ کر رہینگے جو ہیں احکام جابرانہ
ہوگا جو دوست سچا ٹھہریگا وہ یہاں پر دشمن جو ہوگا کوئی ہو جائیگا روانہ
محتاج ہم نہ ہونگے اغیار کے کسی دم انداز اپنا ہوگا انداز خسروانہ
بھوکے نہ ہم مرینگے ننگے نہ ہم رہینگے لٹ کر نہ جا سکیگا اسکا کہیں خزانہ
جاتی ہو یا ہو برجن مسلم ہو یا کہ ہندو ہوگا سلوک باہم سب کا برادرانہ
ہندوستاں میں جینا جنت کا ہوگا جینا کیا کیا مزے نہ دیگا پھر اسکا آب و دانہ

بھولیگی لن ترانی مس میو اپنی ساری　　گاتی پھریگی وہ بھی پھر ہند کا ترانہ

ہم مہر کے سکھاں کیوں ہمنوا نہ ہونگے

اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانہ

یہ یادِ داس

۱۸ ستمبر ۱۹۲۹ء

کیوں نہ ہو معمور ہندوستاں ترنم سے بھلا　　روح تیری کسقدر پُر کیف نغمہ گا گئی

گونجتا ہے اور گونجیگا ابد تک کان میں　　ہند کے دل پر کچھ ایسی کیفیت سے چھا گئی

روح آزادی اسیری میں ہوئی آزاد تر　　راہ آزادی گرفتاروں کو وہ دکھلا گئی

جان جائے آن لیکن ہاتھ سے جانے نہ پائے　　موت تیری ہندیوں میں یہ سبق دہرا گئی

راج ہٹ کے دیکھنے والو نے ہندو دیکھ لیں　　راج ہٹ پر کیسے پر جا ہٹ ہی غلبہ پا گئی

آہ تر سٹھ دن کے بھوکے پہلوان تم پر نثار　　تم تو بھوکے لڑ رہے تھے بھوک تمکو کھا گئی

پُر الم ہے موت لیکن داس تجھکو موت کیا　　زندگی جاوداں تو موت تیری پا گئی

آؤ اے ہندوستاں والو یہ یادِ داس ہم

جبر کو ٹھکرا کے کہدیں تجھپہ آفت آ گئی

مادرِ ہند ۱۶ستمبر ۱۹۲۲ء

(بھاگلپور کالج - مل بیٹھنے کی تقریب)

فخر ہے فخر ہمیں ہند کی فرزندی پر
ملک کوئی بھی نہیں دہر میں اس سے بہتر

پھینک دینگے جو ملیں پھول بدیسی ہم کو
لینگے ہند کے کانٹوں سے بگر دامن بھر

مادرِ ہند کے فرزند ہیں بھائی بھائی
نہ عداوت کا نشاں ہے نہ تعصب کا اثر

مٹ گیا تفرقہ ہندو و مسلم بالکل
کیوں نہ ہو یہ ہیں پسر ہند ہے جنکی مادر

ہم بھی آزاد رہیں ہند بھی آزاد رہے
ہند یو رکھو قدم اس کی طرف بڑھ بڑھ کر

محبت ہے مجھے اپنے وطن سے

۵ستمبر ۱۹۲۳ء

میں پروردہ ہوں جس آب و ہوا کا
مجھے جس سرزمیں نے پوسا پالا

مری جاں اور دل ہے اسپہ شیدا

مجھے اس کا ہے ذرہ ذرہ پیارا
جما ہے میرے دل پر اس کا نقشہ

مجھے اس کیلئے مرنا ہے جینا

ہر اک چپہ لئے سو یادگاریں۔ ہر اک گوشے کے دامن میں بہاریں
گلستاں مجھکو اس کی خارزاریں

وہ اسکی ندیاں اور اسکے تالاب وہ اسکی کھیتیاں اور اسکے سیلاب
یہ میری دلکشی کے باب در باب

مہانندا کی آہستہ خرامی وہ کنکائی کی شوریدہ مزامی
کوئی خالی نہیں از دلربائی

نہ کٹہل کو نہ کچھ آموں کو پوچھو مزا تو سورجاپوری کا چکھو
ملاکر بمبئی سے اور بو لو۔

وہ سرافراختہ پٹوا کے پودے کسانوں کی سرافرازی تھی جس سے
نہاں اس کے ہر اک پتے میں قصے

ذرا تم دھان کے کھیتوں کو دیکھو کسانوں اور مزدوروں سے پوچھو
وہ نغمہ وقت کا بویا ہے کالو۔

وہ اسکی ہاٹ اور سالانہ میلے وہ ناچوں اور گانوں کے جھمیلے
وہ دلکش تان اور نغمے رسیلے

مہیا اک جگہ دنیا کی چیزیں۔ ضرورتمند جو چاہیں خریدیں
ضرورت بھی نہ ہو تو شوق سے لیں

وہ معمور محبت گیت اس کے وہ "ست پیری" دہاتی اسکے قصے

وہ "گھوگلی ویرہ" کے پُردرد نغمے۔

"لبالو سکھسری" کے بھی فسانے
لیے اپنا لوی سارے خزانے
وہ "اللہ کین" کے پاکیزہ گانے۔

برہنہ ان میں فطرت عکس افگن
نہیں جو زیر بار جامۂ فن
فدا ہے ایسے گیتوں پر ہر اک تن

یہی گیتیں ہیں جو کھیتوں میں گائیں
چلانے والے ہل کے جب وہ گرمائیں
چلیں وہ دھوپ میں اور ہل چلائیں

مجھے گر وجد آجائے عجب کیا
سنوں اُن قلبہ رانوں کا جو گانا
سراپا کیف! گانا ہل چلانا۔

کوئی کہتا ہے شائستہ نہیں ہے
روش اسکی پسندیدہ نہیں ہے
وطن میرا گویا اچھا نہیں ہے

خموش اے بے ادب بس چپ ہی رہ جا
مرے منہ پر وطن کا میرے شکوہ
تجھے شائستگی سے واسطہ کیا

مری آنکھوں میں بہتر ہے چمن سے
مجھے خوشتر ہے یہ باغ عدن سے
محبت ہے مجھے اپنے وطن سے